آیت اللہ امام خمینی رحمۃ اللہ علیہ

ایک عرفانی شاعر

ڈاکٹر محمد تقی علی عابدی

پیرم ولی بگوشه چشمی جوان شوم
لطفی که از سراچه آفاق بگذرم

پیری میں جوانی کا جوش و ولولہ رکھنے والے آیت اللہ سیّد روح اللہ خمینیؒ کی ابتدائی تعلیم کے بعد فلسفہ، منطق، کلام، اصول، فقہ، حدیث، تفسیر، ادب وغیرہ کی تعلیم حاصل کر کے ۱۸ سال کی عمر میں ہی آیت اللہ عبدالکریم حائری یزدی، آیت اللہ میر سید علی یثربی کاشانی، آیت اللہ شیخ محمد رضا نجفی اور آیت اللہ شیخ ابوالقاسم کبیر جیسے جید علماء کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے اور بہت جلد اجتہاد کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوگئے۔ نیز حوزۂ علمیہ قم میں فلسفہ کا درس دینا شروع کیا اور کچھ دن بعد فلسفہ کے ساتھ ساتھ ہفتہ میں ایک دن درس اخلاق و عرفان بھی شروع کردیا۔ اس کا چرچا ایران میں ہر چہار جانب ہونے لگا۔ نتیجتاً آیت اللہ خمینیؒ نے شائقین کی کثرت نیز درس اخلاق و عرفان کی افادیت و اہمیت کے مدنظر درس کو ہفتہ میں دودن کردیا۔ اس درس میں عوام کی دلچسپی سے پہلوی حکومت خوفزدہ ہوئی جس کی بنا پر حکومت نے اس درس کو ختم کرنے کی ناکام کوشش بھی کی، لیکن اس وقت تک آیت اللہ خمینیؒ کے بصیرت افروز بیان سے بہت سے شاگرد ایسے تیار ہوچکے تھے جو ظلم و جور، قید و جلاوطنی سے نہیں ڈرتے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے دار کی طرف بڑھنے اور دہکتی ہوئی آگ میں کود پڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔

بہرحال ایک طرف ان افراد نے آیت اللہ خمینیؒ کی اخلاقی و عرفانی تقاریر سے متاثر ہوکر ایران کی ظالم و جابر اور غیر اسلامی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا اور دوسری طرف آیت اللہ خمینیؒ شاہی حکومت کے ظلم کا نشانہ بن کر قید و جلاوطنی کی زندگی گزارنے لگے پھر بھی آیت اللہ خمینیؒ ایران کی شاہی حکومت کے خلاف سخت بیانات جاری کرتے رہے اور عوامی تحریک زور پکڑتی رہی،

جس کی وجہ سے ایران کی صدیوں پرانی شہنشاہیت کا تختہ پلٹا اور جمہوری اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ آیت اللہ خمینیؒ نے اسی جمہوری اسلامی ایران کی دس بہاریں دیکھ کر ۲۸رشوال ۱۴۰۹ھ-۳رجون ۱۹۸۹ء کو انتقال کیا۔

آیت اللہ خمینیؒ صرف ایک انقلابی یا مذہبی رہنما یا مدرس ہی نہیں بلکہ محقق و مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ عرفانی شاعر بھی تھے۔ سید مرتضیٰ حسین فاضل نے اپنی کتاب ''آیت اللہ خمینیؒ قم سے قم تک'' میں آیت اللہ خمینیؒ کی ۲۶ کتابوں کے نام درج کیے ہیں، جس میں مصباح الہدایہ، تحریر الوسیلہ، ولایت فقیہ، جہادِ اکبر، معراج السالکین، تہذیب الاصول، توضیح المسائل عربی اور فارسی کتابیں شامل ہیں۔

آخر عمر میں آیت اللہ خمینیؒ نے اپنی بہو فاطمہ طباطبائی کے اصرار پر کچھ غزلیں کہی تھیں جنھیں ان کے فرزند سیّد احمد خمینی نے ''سبوی عشق'' کے نام سے علامہ خمینیؒ کے چہلم کے موقع پر شائع کیا۔ سیّد احمد خمینی لکھتے ہیں:

"اماما، اکنون که در غم هجرانت می سوزم، غزل هاے از مجموعه اشارت را که به اصرار همسرم، فاطمه طباطبائی در سال های اخیر سروده ای به تشنگانِ زلالِ کوثر هدایت و عرفانیت تقدیم می نمایم۔"

مذکورہ مجموعہ میں آیت اللہ خمینیؒ کی ۱۳۶۵ش ھ-۱۹۸۶ء سے ۱۳۶۸ش ھ-۱۹۸۹ء کے درمیان کہی ہوئی عرفانی غزلوں کو خلوتِ مستان، مستی عاشق، محفل زندان، غمزۂ دوست، چشم بیمار، دریائے فنا، جامہ در آن اور حسن ختام عنوان کے تحت پیش کیا گیا ہے۔

ان کی غزلوں کے اشعار لفظی و معنوی خوبیوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عشقِ الٰہی کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ یوں تو عشق ہر فرد کے لیے لازمی ہے۔ چاہے وہ عشقِ مجازی ہو یا حقیقی۔ عش مجازی صرف حسن ''صورت'' سے وابستہ ہے اور عشقِ حقیقی حسن ''وجہ'' سے جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے جس کے لیے قرآن میں ملتا ہے:

"وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔" **(سورہ رحمٰن، آیت ۲۷)**

حقیقت یہ ہے کہ عشقِ حقیقی میں انسان اپنے کو بھول جاتا ہے۔ وہ دنیا میں ہر کام خدا کے لیے کرتا ہے۔ اس کی موت و حیات، خوشی و غم، سب کچھ خدا کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے ہی عاشق صادق

کے لیے شاعر نے کہا ہے:

میں تو جیتا ہوں کہ دنیا میں ترا نام رہے
یہ بھی ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

یہی خدا کیلئے زندگی بسر کرنا اور اس کو وحدہٗ لاشریک ماننا زندگی کا اصل مقصد ہے۔

علاّمہ خمینیؒ بھی عشقِ الٰہی میں سرشار شخص کو زمانے میں عاقل تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ عشق الٰہی میں سرشار ہوکر اس قدر بے خود ہوجاتا ہے کہ اس کے دل و دماغ سے دنیا کے تفکرات محو ہوجاتے ہیں اور وہ اپنی ظاہری ہستی ختم کر کے فنا فی اللہ ہوجاتا ہے اور جو عارف کامل فنا فی اللہ ہوتا ہے اسی کو بقائے دائمی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی نظر میں جو شخص عاشقِ الٰہی نہیں وہ عاقل نہیں:

دل که آشفتۂ روئ تو نباشد دل نیست آن که دیوانه خال تو نشد عاقل نیست
مستی عاشق دلباخته از بادۂ تست بجزاین مستیم ازعمردگرحاصل نیست
عشقِ روی تو در این بادیه افگند مرا چه توان کردکه این بادیه راساحل نیست

ان کی نظر میں اگر انسان عشق الٰہی میں سرشار ہوئے بغیر اپنی ساری زندگی گزار دیتا ہے تو اس کی اس زندگی کا کچھ حاصل نہیں۔ اور پھر انسان کے پاس اپنا کیا ہے؟ جو کچھ ہے وہ حسن وعشق اور محبت کا جذبہ اللہ کا دیا ہوا ہے لیکن خدا نے عشق کا یہ جذبہ انسان کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں دیا۔ اور انسانوں میں بھی ان انسانوں کو عشق الٰہی کا بار سونپا جو عشق وعشرت کے دلدادہ نہیں بلکہ تمام اسباب راحت و آرام کو ختم کر کے اپنے کو رنج و غم میں مبتلا کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی عاشق صادق، محبوب حقیقی کے دیدار کے لیے ساری دنیا میں سرگرداں اور پریشاں پھرا کرتے ہیں۔ علامہ خمینیؒ کے مذکورہ شعر سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ عشقِ حقیقی کے ذریعہ اس جنگل (بادیہ) میں پہنچ گئے ہیں جس کا کوئی ساحل نہیں ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ تلاش یار میں ہر میکدے، بتکدے، مسجد اور دیر کے بھی چکر لگائے نیز سجدے کیے کہ شاید محبوبِ حقیقی کا دیدار ہوجائے لیکن ہر جگہ سے مایوس ہی لوٹنا پڑا۔

بر در میکده و بتکده و مسجد و دیر
سجده آرم که تو شاید نظری بنمائی

مذکورہ شعر سے علامہ خمینیؒ کی وسیع المشربی کا احساس ہوتا ہے۔ یعنی وہ یہ ثابت کر دینا چاہتے ہیں کہ مسجد، دیر، بتکدہ، میکدہ ہر جگہ صرف ایک عمل انجام دیا جاتا ہے اور وہ ہے تلاش حق۔ تلاش حق کے لیے شراب عشق الٰہی کا پینا لازمی ہے، جس کو وہی پی سکتا ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ شراب عشق پینے کے بعد انسان غم و الم اور تفکرات کو بھلا کر دل و جان میں تازگی محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے علامہ خمینیؒ کہتے ہیں:

من خواستار جام می از دست دلبرم
این راز با که گویم و این غم کجا برم

یعنی آیت اللہ خمینیؒ محبوب کے ہاتھوں سے شراب چاہتے ہیں، لیکن یہ راز دنیا کے کسی دوسرے فرد سے نہیں بتائے، کیونکہ سب ہی خاص طور سے ظاہر پرست شریعت کی آڑ میں طرح طرح کے الزام لگاتے ہیں اور وہی حال ہوتا ہے جو منصور کا ہوا، لیکن دوسری غزل میں آیت اللہ خمینیؒ اسی پوشیدہ راز کو افشا کرتے ہوئے کہتے ہیں:

من بخال لبت ای دوست گرفتار شدم چشم بیمار تو را دیدم و بیمار شدم
فارغ از خود شدم و کوس انا الحق بزدم همچو منصور خریدار سر دار شدم

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ:

بگذارید که از بتکده یادی بکنم من که بادست بت میکده بیدار شدم

لیکن پھر بھی شہر کا واعظ اپنے پند و نصیحت سے آزار پہنچاتا رہتا ہے۔ اسے یہ نہیں معلوم کہ عاشق صادق اپنا دل کھول کر ایک مصیبت میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اس مصیبت کو بھلانے میں شراب ہی مددگار ثابت ہوتی ہے۔

واعظ شهر کو از پند خود آزارمم داد از دم رند می آلوده مددگار شدم

اسی لئے آیت اللہ خمینیؒ اُسی غزل میں کہتے ہیں:

در میخانه گشائید برویم شب و روز که من از مسجد و از مدرسه بیزار شدم

مسجد و مدرسہ سے بیزار ہونے کی وجہ ایک دوسری غزل سے معلوم ہوتی ہے:

در مدرسه از دوست نخواندیم کتابی در مأذنه از یار ندیدیم صدائی

اور ایک غزل میں مسجد و مدرسہ سے بیزار ہونے کے بعد شرابِ عشقِ الٰہی کے لیے یہاں تک کہتے ہیں کہ:

الایا ایها الساقی زمی پرساز جامم را   که از جانم فروریز و هوای ننگ و نامم را

از آن می ریز در جامم که جانم را فنا سازد   برون سازد زهستی هسته نیرنگ و دامم را

مذکورہ اشعار میں غالباً ساقی سے مراد خالقِ کائنات، مئے سے مراد عشق و محبت اور جام سے مراد قلب ہے۔ دراصل سب سے بڑا ساقی وہی عزوجل ہے جو اپنے نیک بندوں کو طاہر شراب پلاتا ہے جس کے لیے قرآن میں ہے:

وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَاباً طَهُوْرًا" (سورۂ دہر، آیت ۲۱)

گویا خالقِ کائنات ہی مجھے عشق و محبت کی ایسی شراب پلاسکتا ہے جس کے ذریعہ میں اپنی دلی خواہشات کو ترک کر کے اس ہستی سے آزاد اور ہستی مطلق (خدا) سے ملحق ہوسکتا ہوں اور ہستی مطلق سے مل جانا ہی حیاتِ دائمی کو حاصل کرلینا ہے۔ شاید اسی لیے آیت اللہ خمینی یہ تمنا کرتے ہیں:

کاش روزے بسر کوی تو ام منزل بود   که در آن شادی و اندوه مراد دل بود

یا:

آید آن روز که خاک سر کویش باشم   ترک جان کرده و آشفته رویش باشم

اور:

جز سرکوی توای دوست ندارم جائی   در سرم نیست بجز خاک درت سودائی

گویا اس منزل تک پہنچنے کی اس قدر آرزو ہے کہ اگر اس سلسلے میں جان بھی چلی جائے یعنی تیرے در کی خاک بھی بن جاؤں تو مضائقہ نہیں کیونکہ ایک پروانہ شمع کے قریب ہونے کے لیے اپنی جان کو نثار کردیتا ہے۔ علامہ کہتے ہیں:

جان باختم بحشرت دیدار روی دوست   پروانه دور شمعم و اسپند آذرم

مذکورہ شعر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ خمینیؒ ہستی مطلق سے ملحق ہونے کے لیے اپنی جان کو اسی طرح نثار کردینا مناسب سمجھتے ہیں جس طرح ایک پروانہ شمع پر نثار ہوکر اسپند کا کام انجام دیتا ہے۔

علاّمہ خمینیؒ کے بعض اشعار سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ریاکار اور ظاہر پرست عالم کے ظاہری لباس سے سخت نالاں تھے کیونکہ وہ اس ظاہری لباس کی آڑ میں سیدھے سادے لوگوں کو فریب دینے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ ان کی نظر میں ظاہری لباس جاہلوں کا لباس ہے اور وہ خود

ایسے لباس سے آزاد ہونے کی دعا کرتے ہیں:

دست من گیر و از این خرقه سالوس رهان   که در این خرقه بجز جایگه جاهل نیست

یعنی کہ خدا! میرے ہاتھ کو پکڑ کر اس ظاہری لباس سے آزادی دلا دے، کیونکہ یہ لباس تو جاہلوں کا لباس ہے جس سے خود بینی اور خودنمائی ہوتی ہے۔ یہ درحقیقت ریاکاری کا جامہ ہے۔ اس کو پہننے والے کا باطن کچھ اور ہوتا ہے اور ظاہر کچھ اور۔ اسی لیے وہ ظاہری زہد و ریا کے لباس کو اُتار کر پیرِ خراباتی بننا پسند کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:

جامهٔ زهد و ریا کندم و بر تن کردم   خرقهٔ پیر خراباتی و هشیار شدم

یعنی پیرِ خراباتی کا لباس پہننے کے بعد انسان ہوشیار ہوکر حوزۂ عرفان میں داخل ہوجاتا ہے جس کے لیے آیت اللہ خمینیؒ کہتے ہیں کہ علم و عرفان تک پہنچنے کا راستہ خرابات کے علاوہ کچھ نہیں:

علم و عرفان بخرابات ندارد راهی   که بمنزلگه عشاق ره باطل نیست

اور جب انسان حوزۂ عرفان میں داخل ہوجاتا ہے تو:

چون بعشق آمدم از حوزهٔ عرفان دیدم   آنچه خواندیم و شنیدیم همه باطل بود

مختصر یہ کہ انھوں نے مے، جام، میکدہ، بتکدہ، زہد، ریا، دیر، مسجد، مدرسہ، خرقہ، سالوس، پیر وغیرہ کا استعمال روایتی انداز میں کیا ہے، جن کے مطالب و مفاہیم کو صوفیانہ اصطلاحات کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں تلاشِ حق کے لیے فنا فی اللہ ہونے، زہد و ریا کا ظاہری لباس اُتارنے اور ترکِ خود پرستی کرنے پر خاص طور سے زور دیا ہے۔ علامہ کا یہ پیغام کسی خاص فرقہ، مسلک، مکتبِ فکر، خطہ یا عہد سے متعلق نہیں بلکہ عوامی پیغام ہے جو اپنی وسعتوں میں ہر دور کو سمیٹے ہوئے ہے جس کی وجہ سے کلام میں، علم و عرفان کی خاص رنگینی اور چاشنی ملتی ہے۔ اسی لیے علامہ خمینیؒ کو بیسویں صدی کا مصلح اور صوفی شاعر تسلیم کیا جاتا ہے جو اپنی آخری منزل پر بھی پیرِ صومعہ کو یہ پیغام دیتے ہوئے جاتا ہے:

بساغر ختم کردم این عدم اندر عدم نامه
به پیر صومعه برگو ببین حسن ختامم را